اندھے کی لکڑی

(عقل سلیم رکھنے والے ہر نوجوان کے نام)

نہیں، سلیم! یہ جو تم نے اندھوں کی قطار دیکھی ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں بچپن کے زمانے سے ہم انہیں اسی طرح دیکھتے چلے آرہے ہیں اور اسی طرح ہمارے بڑے بوڑھوں نے انہیں دیکھا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ اس زمانے میں ان کی تعداد کچھ کم تھی، اب زیادہ ہوگئی ہے۔ نیز اس وقت، سب سے آگے چلنے والے کو کچھ کچھ نظر آیا کرتا تھا، اب وہ بھی بالکل اندھا ہو چکا ہے اور محض قیاس اور روزمرہ کی مشق کے زور پر اپنے جیسے اندھوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ جب میں نے انہیں پہلے پہل دیکھا تھا اس وقت سب سے آگے ایک اور اندھا ہوا کرتا تھا۔ اس کے مرنے پر، اس سے پچھلے اندھے کو ترقی (Promotion) مل گئی اور وہ ان کا راہنما بن گیا اور لائن کے آخر میں دو چار اندھوں کا اضافہ ہوگیا۔ اگلے کی لکڑی پچھلے کے لئے ''دلیل راہ'' یا ''مشعل ہدایت'' بن گئی۔ جس طرف اگلا مڑا، پچھلے بھی مڑ گئے۔ جہاں وہ ٹھہرا، یہ بھی ٹھہر گئے۔ جس قسم کی آواز اس نے نکالی انہوں نے بھی اس کی نقل اتار دی۔ یہ ٹھیک ایک وقت پر بھیک مانگنے کے لئے نکلتے ہیں اور دن بھر مقررہ راستوں پر چلتے، شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی ان کی مستقل روش ہے جس پر یہ عمر بھر چلتے رہتے ہیں اور چلتے چلتے قبر تک پہنچ جاتے ہیں اور چونکہ ساتھ ساتھ لائن میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کا سلسلہ دراز کبھی ختم نہیں ہوتا۔

پہلے دن سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ اندھے بدلتے جاتے ہیں لیکن ان کی لائن بدستور قائم رہتی ہے۔ نہ ان کی روش میں فرق آتا ہے نہ راستوں میں تبدیلی، نہ ان کی آواز بدلتی ہے۔ نہ ان کی روش میں فرق آتا ہے نہ راستوں میں تبدیلی، نہ ان کی آواز بدلتی ہے نہ رفتار۔ جب کبھی ان میں سے کسی پچھلے سے پوچھتے ہیں کہ تم اس راستے پر کیوں

جا رہے ہو تو وہ اطمینان سے کہہ دیتا کہ اس لئے کہ مجھ سے آگے چلنے والا اسی راستے پر جا رہا ہے، اور جب سب سے آگے چلنے والے سے پوچھئے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے جس کی جگہ لی ہے وہ اسی راستے پر چلا کرتا تھا۔ اور چونکہ وہ پیشرو اب مر چکا ہے۔ اس لئے یہ آپ کسی سے پوچھ ہی نہیں سکتے کہ وہ اس راستے پر کیوں چلا کرتا تھا۔

اندھوں کی قطار:

غور کرنے پر تمہیں نظر آ جائے گا سلیم! کہ اندھوں کی ایک قطار ہے جو شاہراہ انسانیت پر، روز ازل سے آج تک مسلسل و متواتر چلی آ رہی ہے۔ جب کوئی آنکھوں والا ان سے کہتا ہے کہ تم جس راستے پر جا رہے ہو وہ غلط ہے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی راستے پر چلتے دیکھا ہے اس لئے ہم اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام:

ان آنکھوں والوں میں ہمارے سامنے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام آتے ہیں۔ انہوں نے ان سے کہا:

> يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (23:23)
>
> اے میری قوم کے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور اس کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار ہستی ایسی نہیں جس کی تم اطاعت کرو۔

بات کس قدر صاف اور واضح تھی لیکن انہوں نے نہ تو اسے قبول کیا اور نہ ہی اس کی تردید کی کوئی دلیل اور برہان پیش کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ: مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ (23:24) ہم نے اپنے آباواجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو بات تم کہتے ہو اس میں ہمارے نزدیک یہ غلطی اور یہ سقم ہے بلکہ یہ کہ جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو، چونکہ ہم سے پہلے اندھے اس راستے پر نہیں چلا کرتے تھے اس لئے ہم بھی اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم اسی روش پر چلتے جائیں گے جس پر وہ چلا کرتے تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہم حضرت صالح علیہ السلام کو دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنی قوم سے یہی

کہتے ہیں کہ: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (11:61) اس کے جواب میں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ: اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (11:62) جن معبودوں کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے، تُو ہمیں اُن کی پرستش سے روکتا ہے؟ یعنی وہی آباو اجداد جنہوں نے حضرت نوح اور حضرت ھود علیہم السلام کے زمانے میں صحیح روش اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، اب اُن کے لئے دلیل اور سند بن گئے! اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اندھا مر جائے، وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آنکھوں والا بن جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں۔ وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں کہ: مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ (21:52) ان مورتیوں کی حیثیت کیا ہے جن کے سامنے تم جھکتے ہو؟ تم انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر ان کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہو؟ سوچو کہ اس روش میں عقل اور انسانیت کی کوئی رمق تک بھی ہے؟ اس کے جواب میں ان اندھوں نے وہی کچھ کہا جو ان سے پہلے اندھے کہتے تھے۔ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ (21:53) انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو انہی کی پرستش کرتے دیکھا ہے، اس لئے ہم بھی ان کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم اپنے اسلاف کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو غصہ تو بہت آیا (اور ہر سمجھدار کو غصہ آئے گا۔) لیکن ان عقل کے اندھوں سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ: لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ (21:54) تم اور تمہارے اسلاف کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں تھے! لیکن ”کھلی ہوئی گمراہی“ تو اسے ہی نظر آ سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ جو آنکھیں بند کئے اگلے اندھے کی لکڑی کے سہارے چلا جا رہا ہو اسے غلط اور صحیح راستے میں تمیز کس طرح ہو سکتی ہے۔ جو آنکھیں بند کر لے اسے سورج کی روشنی کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام:

اور وہ دیکھو سلیم! قوم مدین سے حضرت شعیب علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (11:84) اطاعت اور محکومی صرف خدا کے قانون کی ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کوئی اور صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں۔ اس کے

جواب میں ان کی قوم کیا کہتی ہے؟ وہی جو ان سے پہلے دور کے اندھے کہتے تھے۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (11:87) اے شعیب (علیہ السلام)! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان کی پرستش چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤاجداد کرتے تھے۔۔۔ وہی اندھے کی لکڑی!

تم نے دیکھا سلیم! کہ شروع سے آخر تک کس طرح ان اندھوں کی طرف سے ایک ہی جواب ملتا رہا ہے؟ اندھے، اس کے سوا کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے۔ ان کے پاس اپنی روش کے جواز میں کوئی دلیل اور برہان نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ دلیل و برہان تو اس کے پاس ہوتی ہے جس نے کسی راستے کو دیکھ بھال کر، اپنے انتخاب سے اختیار کیا ہو۔ لیکن جو شخص کسی راستے پر اس لئے چل رہا ہو کہ اس کے اباؤاجداد اسی راستے پر چلا کرتے تھے، اس کے لئے دلیل و برہان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جاتا تو انہی کے راستے پر چلنے لگتا۔

نبی اکرم ﷺ:

یہ تو انبیائے سابقہ کا تذکرہ تھا۔ جب نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو آپ ﷺ کو بھی اس کا یہی جواب ملا جو پہلے انبیاءؑ کو ملا کرتا تھا۔ یعنی حضور ﷺ کی دعوت پر اگلے اندھے نے پچھلے اندھوں سے کہا کہ: مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ج (34:43) یہ شخص چاہتا ہے کہ جن معبودوں کی پرستش تمہارے آباؤاجداد کیا کرتے تھے تمہیں اس راستے سے روک دے: مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ج (38:7) جو کچھ یہ کہتا ہے ہم نے اپنے پچھلے مسلک و مذہب میں ایسا کہیں نہیں سنا۔ اس لئے اس کی بات سچی نہیں ہو سکتی۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ صلے (38:7) یہ محض بناوٹ ہے اس کا خود ساختہ دعویٰ ہے۔ حق و صداقت کا راستہ وہی ہے جس پر ہم اپنے اسلاف کی تقلید میں چلتے آ رہے ہیں۔

غرضیکہ حضرت نوح علیہ السلام ہوں یا ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام ہوں یا شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں یا آخرالزماں ﷺ ہر آنکھوں والے کو اندھوں کی قطار کی طرف سے یہی جواب ملتا رہا کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (43:22) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریق پر چلتے دیکھا ہے۔ اور ہم انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ط (43:24) ان کے رسول ان سے

کہتے رہے کہ جس راستے کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اگر وہ راستہ تمہارے اسلاف کے راستے سے زیادہ واضح، روشن اور یقینی طور پر منزل کی طرف لے جانے والا ہو تو کیا تم پھر بھی اسلاف ہی کے راستے کو ترجیح دو گے؟ وہ کہتے کہ ہمارے لئے تقابل اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہم کوئی اور بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴿۲۳﴾ (43:23) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راستے پر چلتے پایا ہے اور ہم انہیں کے نقوش پا پر آنکھیں بند کئے چلتے جائیں گے۔ اندھے کی لکڑی سب سے زیادہ محفوظ اور عافیت رساں ہوتی ہے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴿۱۰۴﴾ (5:104) اگر صورت یہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کو حقیقت کا کچھ علم نہ ہو اور وہ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہے ہوں تو کیا تم پھر بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے؟ جواب ملتا کہ بے شک ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے۔ اس لئے کہ: حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (5:104) ہمارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اپنے آباء کے راستے پر چل رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

مترفین کا مسلک:

تم نے دیکھا سلیم! کہ شاہراہ انسانیت پر کس طرح اندھوں کی ایک قطار ہے جو مسلسل ومتواتر ایک ہی ڈگر پر چلے جا رہی ہے۔ ہر پچھلا اندھا اپنے اگلے اندھے کو اپنا ہادی اور راہنما سمجھتا ہے اور اس کی لکڑی کو اپنی روش کے برسرِ حق ہونے کی دلیل وحجت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود، اس قسم کی اندھی روش کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کا جواب ایک لفظ میں دے دیا ہے وہ کہتا ہے کہ: وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴿۲۳﴾ (43:23) اسی طرح ہم نے جس قوم کی طرف بھی کوئی رسول بھیجا، تو اس قوم کے مترفین نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک روش پر چلتے پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ مترفین کے معنی ہیں، وہ لوگ جو خود کچھ کام نہ کرنا چاہیں اور دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ سہل انگار۔ محنت سے جی چرانے والے۔ اس میں دونوں باتیں آگئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اندھی تقلید میں انسان کے ذہن کو ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ سوچ سمجھ کر

راستہ اختیار کرنے کے لئے انسان کو بڑی ذہنی کاوش اور فکری جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے برعکس اسلاف کی پامال راہوں اور آباؤ اجداد سے وراثتاً منتقل ہو کر آنے والے مسلک پر چلنے کے لئے کسی سعی و کاوش اور تگ وتاز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کوئی سوال سامنے آئے اس کے متعلق بس اتنا بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس باب میں فلاں حضرت نے یہ کہا ہے اور فلاں بزرگ کا یہ ارشاد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی قسم کی فکری کاوش درکار ہی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی قوموں میں سب سے بڑا عالم وہ ہوتا ہے جسے سب سے زیادہ حوالے یاد ہوں۔ یعنی جو سب سے بڑا (Cataloguer) ہو وہ سب سے بڑا عالم ہوتا ہے۔ اس کے لئے صرف حافظہ (Memory) کی ضرورت ہوتی ہے فکر (Intellect) کی ضرورت قطعاً نہیں ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اس روش سے، روٹی بڑی آسانی سے مل جاتی ہے۔ عوام جس راستے پر چل رہے ہوں، آپ اس کی تائید کرتے جایئے پھر دیکھئے کہ کس طرح آپ کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ جو تم بڑی بڑی مقدس دکانیں دیکھ رہے ہو اور ان کی ''بکری'' پر اس قدر متعجب ہوتے ہو تو ان کی تجارت کا راز۔۔۔(Trade Secret) ہی یہ ہے کہ ان سے کہا جائے کہ جس راستے پر تم اور تمہارے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہیں، وہ راستہ جنت میں لے جانے کا ہے۔

تجارت کا راز:

تجارت کا دوسرا راز یہ ہے کہ ہم پیشہ لوگ آپس میں کتنی ہی سر پھٹول کیوں نہ کریں، جونہی کوئی باہر کا آدمی اس پیشہ کے خلاف کچھ کہے، سب اس کی مخالفت میں متحدہ محاذ بنالیں۔ یعنی ان کی باہمد گر پیوستگی کا موجب صرف اس پیشہ کا مفاد ہو گا۔ یہ جو مختلف پیشوں۔۔۔ (Professions) والوں کی (Unions) دیکھتے ہو تو ان کی وجہ جامعیت اپنے پیشے کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور بس۔ یہی وہ چیز ہے جو مذہبی مترفین کو باہمد گر مربوط رکھتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا تھا جب انہوں نے بت خانہ کے منتریوں (مذہبی پیشواؤں) سے کہا تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ بتوں کی حقیقت کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے خلاف لب کشائی نہیں کرتے کیونکہ ان بتوں کی وجہ سے ان کا مذہبی جتھہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس جتھہ میں کمزوری آجائے تو یہ جو اس وقت عیش کی زندگی

بسر ہورہی ہے، وہ باقی نہیں رہے گی۔ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (29:25) ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر بت پرستی اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ اس کی رو سے دنیاوی زندگی میں تم میں باہمی ربط اور پیوستگی قائم رہتی ہے۔ اس سے تمہارا جتھہ بنا ہوا ہے اور جتھے میں رہتے ہوئے تمہیں بہت سے مفاد حاصل ہیں۔

عوام کو بھڑکا کر:

اس جتھے کو مضبوط رکھنے کے لئے ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ جونہی کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہوا، انہوں نے عوام کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کر دیا کہ دیکھنا! یہ شخص تمہارے دین میں فتنہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تمہیں اس روش سے ہٹانا چاہتا ہے جس پر تمہارے آباؤ اجداد چلتے تھے۔ اگر تم نے اس فتنہ کا سر نہ کچلا تو یہ تمہارے معبودوں کو تباہ کر کے رکھے گا۔ اُٹھو! قَالُوا اقْتُلُوْهُ (29:24) اسے قتل کر دو۔ حَرِّقُوهُ ۔ اسے زندہ جلا دو۔ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ (21:68) اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کر دو۔ یہی وہ حربہ ہے جسے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ: فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ (20:47) تم بنی اسرائیل پر ظلم وستم سے باز آجاؤ اور انہیں ہمارے ساتھ جانے دو تاکہ یہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لے سکیں۔ بجائے اس کہ فرعون اس موضوع پر بات کرتا اس نے بات کا رخ بدل کر چاہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاردار جھاڑیوں میں الجھا دیا جائے۔ فرعون کے دربار میں اس کے امراء وزراء بیٹھے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی باطل پرست تھے اور ان کے آباؤ اجداد بھی گمراہ۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ بنی اسرائیل کی بات تو بعد میں ہوگی پہلے یہ بتاؤ کہ: فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (20:51) جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں (یعنی ان امراء و وزراء کے اسلاف) وہ کس حال میں ہیں؟ ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ صاف ظاہر ہے کہ اس سوال سے فرعون کے پیش نظر کیا شرارت تھی؟ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے مدمقابل کون ہے؟ اس کے مدمقابل تھا خدا کا رسول جو ایسے مقامات کی نزاکتوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا کہ: عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ (20:52) ان کا علم میرے رب کے ہاں مکافات عمل

کے رجسٹر میں درج ہے۔ وہ اس باب میں نہ بھولتا ہے نہ غلطی کرتا ہے۔ ان کا معاملہ اس کے ساتھ ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دیتے ہو یا نہیں؟

دورِ حاضر میں:

یہی کچھ مترفین کا طبقہ پہلے کرتا تھا۔ یہی کچھ وہ آج کرتا ہے۔ جونہی کسی نے ان سے کہا کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اور عوام کو چلا رہے ہو، اس کے متعلق اتنا تو دیکھ لو کہ قرآن کے مطابق صحیح ہے یا غلط۔ تو انہوں نے عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ: اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ پکڑلو۔ جانے نہ دو۔ یہ فتنہ ہے اس کا سر کچل دو۔ مقصد اس سے صرف یہ کہ کہیں ان کی بے بصری کا پول نہ کھل جائے اور جو عیش بغیر محنت کئے حاصل ہیں، ان پر زد نہ پڑے۔ اس کے لئے ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قوم کو سوچنے سے باز رکھا جائے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے متبعین نے سوچنا شروع کر دیا تو وہ ان سے باغی ہو جائیں گے۔

لیکن اس سے سلیم! اتنا ہی نہیں ہوتا کہ قوم وقتی طور پر سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا اثر بہت دوررس اور اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے ہیں فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی ذی حیات کچھ عرصہ تک اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے اور یہ روش کچھ نسلوں تک متواتر قائم رہے تو اس کے بعد وہ عضو ہی مفقود ہو جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، گول ڈاک خانہ کے پاس ایک اندھا لڑکا بھیک مانگا کرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ لڑکا شروع میں اندھا نہیں تھا۔ اس نے اندھا بن کر بھیک مانگنی شروع کی۔ دن بھر وہ اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہتا۔ دو چار سال کے بعد اس کی بینائی سچ مچ جاتی رہی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ جب کوئی اندھی تقلید کا مسلک اختیار کر کے غور و فکر کرنا چھوڑ دے تو کچھ مدت کے بعد اس قوم سے غور و فکر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ تم مجھ سے بار بار پوچھا کرتے ہو کہ مسلمانوں میں ارباب عقل و فکر کا اس قدر قحط کیوں ہے۔ ان کے ہاں صاحبان عقل و بصیرت کیوں پیدا نہیں ہوتے جب کہ دنیا کی دوسری قوموں میں ان کی اتنی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم نے صدیوں سے فکر و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دیا ہے، اس لئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے اٹل قانون کے مطابق ان سے فکر و تدبر کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔

تقلید کا طوق:

اس گول ڈاکخانے والے اندھے کی طرح ان کی بینائی سلب ہو چکی ہے۔ تقلید کا یہی نتیجہ

ہوتا ہے۔اِنَّا جَعَلۡنَا فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ اَغۡلٰلًا فَہِیَ اِلَی الۡاَذۡقَانِ فَہُمۡ مُّقۡمَحُوۡنَ ﴿۸﴾ (36:8)
ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال دیئے جاتے ہیں جن سے ان کے سر اٹھے کے اٹھے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنی گردن ٹھوڑی سے نیچے کر نہیں سکتے۔اس لئے انہیں اپنے سامنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔وَ جَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡہِمۡ سَدًّا وَّ مِنۡ خَلۡفِہِمۡ سَدًّا فَاَغۡشَیۡنٰہُمۡ فَہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۹﴾ (36:9) ان کے سامنے بھی روک پیدا ہوجاتی ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کی بینائی سلب ہوجاتی ہے۔وَ سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰﴾ (36:10) انہیں سمجھانا نہ سمجھانا برابر ہوتا ہے۔یہ کبھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ مَرۡجِعَہُمۡ لَاِالَی الۡجَحِیۡمِ ﴿۶۸﴾ (37:68) ان کی یہ روش انہیں جہنم کی طرف لے جائے گی اس لئے کہ:اِنَّہُمۡ اَلۡفَوۡا اٰبَآءَہُمۡ ضَآلِّیۡنَ ﴿ۙ۶۹﴾ (37:69) انہوں نے جس گمراہ کن روش پر اپنے باپ دادا کو پایا اسی روش پر یہ خود چلے جا رہے ہیں۔چونکہ ان کی نگاہیں ہمیشہ اسلاف کی طرف لگی رہتی ہیں اس لئے ان کے نزدیک ماضی تو درخشندہ اور تابناک ہوتا ہے اور مستقبل تیرہ و تار۔ان سے جب سنئے یہ اپنے ماضی کے قصے دہراتے رہیں گے۔اور اس سے بہت خوش ہوں گے۔یہ ماضی کو ست جگ (حق وصداقت کا زمانہ) اور مستقبل کو کلجگ (تباہی کا دور) قرار دیں گے۔تمہیں یاد ہے شملہ میں وہ لڑکا،فتو گوجر، جب تمہیں راستہ دکھانے کے لئے سڑک تک جاتا تھا تو لالٹین لے کر تمہارے پیچھے پیچھے چلتا تھا تو تمہیں بار بار کہنا پڑتا تھا کہ روشنی لے کر آگے آگے چلو۔لالٹین کے پیچھے رکھنے سے، طے کردہ راستہ تو روشن ہوجاتا تھا لیکن سامنے کا راستہ خود تمہارے سائے سے تاریک۔تر ہوجاتا تھا۔یہی حالت ماضی پرست قوم کی ہوجاتی ہے۔اس کے نزدیک گزرا ہوا زمانہ درخشندہ ہوتا ہے اور اپنا زمانہ اور آنے والا دور تاریک یہی وہ جہنمی ذہنیت ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہاں چہرے الٹے ہوتے ہیں۔یعنی آنکھیں سامنے کی طرف ہونے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوتی ہیں۔یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ (33:66) اس کی وجہ کیا ہوتی ہے،اس کی تصریح اگلی آیت میں کردی جہاں فرمایا کہ وہ کہیں گے کہ: اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا ﴿۶۷﴾ (33:67) بجائے اس کے کہ ہم اپنی عقل وفکر سے کام لے کر زندگی کی صحیح روش پر چلتے جو خدا نے متعین کی تھی۔

حیوانی سطح کی زندگی:

ہم اپنے بڑوں کی اطاعت کرتے رہے اور انہوں نے ہمیں یوں گمراہ کر دیا۔ یہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ انسانی سطح سے نیچے گر کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ''بھیڑ چال'' کا محاورہ حیوانی سطح کا آئینہ دار ہے۔ اندھوں کی یہ قطار انسانوں کا گروہ نہیں بلکہ بھیڑوں کا ریوڑ ہوتی ہے۔ دیکھو سلیم! قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ (7:179) انسان شہری ہوں یا دیہاتی، ان کی اکثریت جہنم ہی کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ (7:179) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ (7:179) ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھنے بھالنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (7:179) ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ (7:179) یہ دیکھنے میں انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوانوں کی مانند ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (7:179) یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کہ انسانیت نام ہی اس کا ہے کہ اپنی عقل و فکر سے کام لیا جائے۔ اندھوں کی قطار میں چلنے والے انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں۔ بھیڑ چال، انسانیت کا خاصہ نہیں، حیوانی روش ہے۔ اسی حقیقت کو سورہ بقرہ میں بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ:

قرآن کی نہیں، اسلاف کی اتباع:

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (2:170) (قرآن) کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مذہب کا اتباع کرتے رہیں گے۔ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (2:170) جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ خواہ تمہارے آباؤ اجداد کچھ بھی عقل و شعور نہ رکھتے ہوں اور غلط راستوں پر چلتے رہے ہوں تم اس پر بھی ان ہی کی پیروی کرتے رہو گے؟ اس کے بعد ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً

وَّنِدَآءً ؕ (7:171) یہ لوگ جو سیدھے رستے پر چلنے سے انکار کرتے ہیں ان کی مثال یوں سمجھو کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے اور ان کے پیچھے ایک چرواہا۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں بلا الفاظ اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا معنی ومطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور الفاظ دہراتا ہے اور بھیڑ بکریاں جوان اشاروں کی عادی ہو چکی ہیں، بلا سوچے سمجھے اِدھر اُدھر مڑ جاتی ہیں۔ بس یہی حالت آباء کی تقلید کرنے والوں کی ہے۔ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ﴿۱۷۱﴾ (2:171) بہرے، گونگے، اندھے، عقل وخرد سے کام نہ لینے والے جانور، انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے؟

اس آیت پر پھر غور کرو سلیم! کہ وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ (2:170) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ: مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (2:170) (قرآن) کا اتباع کرو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مذہب ومسلک کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں یعنی قرآن مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (2:170) کے اتباع اور مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ (7:170)۔ (اسلاف کے مسلک) کے اتباع کو ایک دوسرے کے مقابل لایا ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ چیز جس طرح نزول قرآن کے زمانے میں حقیقت تھی اسی طرح آج بھی حقیقت ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے فرقے ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق میں الجھے رہتے ہیں لیکن جونہی کوئی شخص انہیں قرآن کے اتباع کی طرف دعوت دے تو یہ سب پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور اسے ''دین'' کے لئے عظیم فتنہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔ مختلف فرقے، ایک دوسرے سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھیں، ان میں سے کوئی بھی مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ (7:170) کے خلاف نہیں ہوتا۔ اس کے خلاف آواز اسی کی ہوتی ہے جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ آواز ان میں سے کسی کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کی ذہنیت:

قرآن کے متعلق مسلمانوں کی ذہنیت یہ ہو چکی ہے کہ جب ان کے سامنے اس قسم کی آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق ہے۔ وہ عیسائیوں کے متعلق۔ فلاں آیت قریش مکہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ فلاں منافقین مدینہ کے متعلق۔ گویا یہ

تمام آیات دوسروں کے متعلق ہیں۔ ہمارا ان سے (اور ان کا ہم سے) کوئی واسطہ نہیں۔ یہی کچھ ہم ان آیات کے متعلق کہہ دیتے ہیں جن میں قرآن نے اسلاف کی تقلید سے منع فرمایا ہے۔ ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ آیات یہود و نصاری اور مشرکین مکہ کے متعلق ہیں۔ ہمارے متعلق نہیں۔ حالانکہ قرآن کے یہ قوانین ابدی ہیں اور ہم پر بھی ان کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح اس کے زمانۂ نزول کے مخاطبین پر ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، ہم اسے گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ ان آیات کو اپنے اور اپنے اسلاف سے متعلق قرار دیں۔ اس سے ہمارے دل کو ٹھیس لگتی ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارے بزرگوں کی سوء ادبی ہوتی ہے۔ جہاں تک دل کو ٹھیس لگنے کا تعلق ہے آپ سوچئے کہ ان آیات سے جس طرح آپ کے دل کو ٹھیس لگتی ہے اسی طرح ان لوگوں کے دل کو بھی ٹھیس لگتی ہے جن کے متعلق آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آیات آئی ہیں۔ (یعنی غیر مسلموں کے متعلق) اپنے دل کی ٹھیس کا اس قدر خیال کرنا اور دوسروں کے دل کی ٹھیس کی ذرا بھی پروانہ کرنا یہ تو کچھ اچھی ذہنیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنی تعلیم کے سلسلے میں ''اپنے اور پرائے'' میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ان قوانین کے بیان کرتے وقت ''اپنا یا پرایا'' اس کے پیش نظر ہوتا ہی نہیں۔ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور یہ بتا دیتا ہے کہ جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے ان کا انجام یہ ہوگا اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے ان کی روش کے عواقب یہ ہوں گے۔ اس کے بعد وہ دنیا کی ہر قوم (مسلم و غیر مسلم) سے کہتا ہے کہ وہ اسی اصول کی روشنی میں اپنی اپنی روش کا جائزہ لیں اور خود اندازہ کر لیں کہ اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس میں کسی کے دل کو ٹھیس لگنے یا نہ لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی شخص (یا گروہ) اس بات سے برا منا لیتا ہے کہ قرآن نے اس کی یا اس کے اسلاف میں سے کسی کی غلط روش کو غلط کیوں کہا ہے تو وہ بُرا منایا کرے۔ قرآن اس کے جذبات کی رعایت سے غلط کو صحیح کبھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ اس میں بُرا ماننے کی بات ہی کچھ نہیں۔ اگر تم پر (قرآن کی روشنی میں) یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ تمہاری فلاں روش غلط ہے تو تم اسے چھوڑ دو اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے اسلاف میں فلاں کی روش غلط تھی تو تمہیں اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ اپنے معاملات کا آپ ذمہ دار تھا۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ (2:141) یہ (تمہارے اسلاف) گذر چکے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ

(2:141) جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے جو کچھ تم کرتے ہو اس کے ذمہ دار تم ہو۔ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۱۴۱ (2:141)

تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟ اس لئے اس میں تمہارے بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟

لیکن اسلاف پرستی کا بُرا ہو کہ وہ انسان کو صداقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتی!

پھر اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم اپنے اسلاف کے متعلق یہ فیصلہ کرلو کہ ان کی ہر بات غلط تھی وہ کہتا صرف یہ ہے کہ ان کی باتوں کو (یا جو باتیں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں) قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لو۔ جو باتیں ان میں سے قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح سمجھو۔ جو ان کے مطابق نہ ہوں، انہیں غلط سمجھو۔ اس لئے کہ صحیح اور غلط کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ (2:120) ہدایت تو صرف وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔

قرآن کا فائدہ؟:

اس مقام پر ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ ان (اسلاف پرست) حضرات کے سامنے جب اسلاف میں سے کسی کی کوئی ایسی بات پیش کی جائے جو قرآن کے خلاف ہو تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی تو قرآن تھا اور وہ ہم سے بہترین قرآن سمجھتے تھے۔ لہٰذا جو کچھ انہوں نے کہا ہے (اگرچہ وہ ہمیں قرآن کے خلاف نظر آتا ہے) لیکن ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں۔ اس دلیل کو سلیم! ذرا آگے بڑھاؤ تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ (اس خیال کے مطابق) قرآن اب ہمارے لئے بے کار ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی ہر آیت کے متعلق اسلاف نے کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے اور چونکہ ہم نے اسی کو قرآن کی تعلیم سمجھنا ہے جسے ان اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ان اسلاف کے نوشتے ضروری ہوں گے، نہ کہ قرآن۔ اگر ہمارے پاس یہ نوشتے موجود ہوں۔ اور قرآن نہ ہو تو اس سے کچھ کمی واقع نہیں ہوگی۔ لہٰذا ہمارے لئے قرآن بے کار ہے اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کا مصرف صرف اس کی تلاوت (پڑھ لینا) رہ گیا ہے۔ عمل اسی پر ہے جو اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں جو لوگ قرآن کی تفاسیر لکھتے ہیں ان میں

زیادہ سے زیادہ زبان ان کی اپنی ہوتی ہے مطالب ومعانی سب وہی ہوتے ہی جو اسلاف نے بیان کردیئے ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کا کوئی ایسا مفہوم بیان کرے جو اسلاف کے بیان کردہ مفہوم سے مختلف ہوتو اس کی اس کوشش کو مردود، اور اسے دین کے لیے فتنہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن کی وہی تفسیر معتبر سمجھی جاتی ہے جو حرفاً حرفاً سلف کے مسلک کے مطابق ہو۔

تدبر وتفکر:

قرآن میں بے شمار آیات ہیں جن میں تدبر وفکر (غور وفکر) کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکم کسی خاص زمانے کے لوگوں کے لئے ہے اس کے بعد یہ منسوخ سمجھا جائے۔ لہٰذا تدبر فی القرآن کا حکم ہمارے لئے بھی ویسا ہی ہے جیسے ہمارے اسلاف کے لئے تھا۔ لیکن ان حضرات کے تصور کے مطابق ہمارے لئے یہ حکم منسوخ ہے۔ تدبر جو کچھ کیا جانا تھا اسلاف نے کرلیا۔ لیکن یادرکھو! نہ تو ہم خدا کے ہاں یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم نے فلاں مسلک کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ ہمارے اسلاف کا مسلک تھا اور نہ ہی ہمارے اسلاف ہماری اس روش کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے۔ بلکہ وہ ہم سے بیزاری کا اعلان کردیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ: اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِيۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا وَرَاَوُا الۡعَذَابَ وَتَقَطَّعَتۡ بِهِمُ الۡاَسۡبَابُ ﴿۱۶۶﴾ (2:166) جب وہ لوگ جنہیں دوسروں نے اپنا پیشوا بنالیا تھا، اپنے متبعین سے اظہارِ بیزاری کریں گے اور یہ متبعین عذابِ خداوندی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور جن سہاروں کو وہ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے (یعنی تقلید اسلاف) وہ ایک ایک کرکے ٹوٹتے نظر آئیں گے تو اس وقت انہیں یہ حسرت ہوگی کہ اگر زندگی کا دھارا ایک بار کہیں پیچھے مڑ جائے تو پھر ہم اپنے ان پیشواؤں سے اسی طرح اظہارِ بیزاری کریں جس طرح انہوں نے ہم سے اظہارِ بیزاری کیا ہے۔ (2:167) لیکن انہیں معلوم نہیں کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف کبھی نہیں مڑا کرتا۔ زندگی وہ جوئے رواں ہے کہ اس میں جو پانی آگے نکل گیا وہ واپس نہیں آسکتا۔ زندگی ''آواگون'' کے چکر (تناسخ) میں نہیں گھومتی۔ یہ سیدھے راستے پر آگے کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے ظہور نتائج کے وقت اس کی آرزو کرنا کہ ہمارے اعمال واپس کردیئے جائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کرلیں، موہوم خیال اور ناکام آرزو ہوگی۔

اسلاف بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اسلاف میں سے جو فی الواقع صالح تھے انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا ہوگا کہ ہمارے اقوال کی اندھی تقلید کرتے رہو۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا ہوگا کہ اطاعت صرف احکام خداوندی کی کی جائے گی۔ تم ہمارے اقوال کو بھی کتاب اللہ کی سند اور تائید کے بغیر مت مانو۔ باقی رہے وہ لوگ جو دیدہ و دانستہ دوسروں کو اپنے پیچھے لگاتے ہیں تاکہ اس سے ان کی ''دکانداری'' بڑھے تو قرآن نے کئی ایک مقامات میں اس منظر کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب یہ پیشوا اور ان کے متبعین جہنم میں جمع ہوں گے اور وہاں ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ تم ہماری تباہی کا باعث ہو۔ مثلاً سورہ ابراہیم میں ہے کہ: فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ (14:21) یہ متبعین اپنے پیشواؤں سے کہیں گے کہ ہم تمہارا اتباع کیا کرتے تھے تو کیا تم اس عذابِ خداوندی کو جو ہم پر مسلط ہو رہا ہے، ہم سے دور نہیں کرو گے؟ اس کے جواب میں وہ پیشوایانِ مذہب اور ہادیانِ سیاست، ان سے کہیں گے کہ: لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ (14:21) اگر اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی دیتا تو ہم تمہیں بھی وہ راستہ دکھا دیتے، اس وقت تو جس طرح بے بس اور لاچار تم ہو ہم بھی ویسے ہی ہیں: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾ (14:21) اب چیخنے چلانے سے کیا حاصل ہے۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس لئے اب اس عذاب کو برداشت کرنا ہوگا۔

جہنم میں مکالمہ

سورۂ سباء میں ان کے باہمی مکالمات کو ذرا تفصیل سے درج کیا گیا ہے: يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ (34:31) یہ متبعین اپنے سرداروں اور پیشواؤں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔ تم ہی نے ہمیں گمراہ کیا۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ (34:32) وہ پیشوا اور سردار، ان سے کہیں گے کہ تم ہمیں موردِ الزام کس منہ سے قرار دیتے ہو۔ خدا کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ کیا ہم نے تمہیں اس کے اتباع سے زبردستی روکا تھا؟ تم نے خود ہی اس کے اتباع کی بجائے ہمارے پیچھے

چلنا شروع کر دیا۔ مجرم تم خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو۔

تم نے دیکھا سلیم! ان پیشواؤں نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟ یہ جواب کہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ تمہیں کس نے کہا تھا کہ اسے چھوڑ کر ہماری تقلید کرو؟ تم نے خود ہی ہمیں معبود بنا دیا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ: بَلۡ مَكۡرُ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ اِذۡ تَاۡمُرُوۡنَنَاۤ اَنۡ نَّكۡفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجۡعَلَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا ؕ (34:33) یہ ٹھیک ہے کہ تم ہمیں ڈنڈے کے زور سے اپنے پیچھے نہیں لگایا کرتے تھے لیکن تم دن رات ایسی تدبیریں کیا کرتے تھے کہ جن سے ہم قانونِ خداوندی سے انکار کر کے تمہیں خدا کا ہمسر بنا لیں۔ ہم ان تدبیروں کے حریف نہیں ہو سکتے تھے اس لئے تمہارا اتباع اختیار کر لیتے تھے۔ یہ بھی تو جبری اطاعت ہی تھی اگرچہ اس کے لئے جو طریق تم نے اختیار کیا تھا اس میں بظاہر جبر نہیں دکھائی دیتا تھا۔

سلیم! اس مکالمہ پر غور کرو اور پھر دیکھو کہ قرآن کس کس انداز و اسلوب سے بیان حقیقت کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ عوام (متبعین) کہیں گے کہ: رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِيۡلَا ۝ (33:67) اے ہمارے پروردگار! تو انہیں دگنا عذاب دے۔ ایک ان کی اپنی غلط روی کی وجہ سے اور ایک اس وجہ سے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ اس لئے انہیں خوشگواریوں اور سعادتوں سے دور رکھ۔ بہت دور۔

سورہ اعراف میں یہی مکالمہ اسلاف اور اخلاف کے درمیان بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بعد میں آنے والی نسل اپنی پیشرو نسل کے متعلق کہے گی کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ اس لئے انہیں دگنا عذاب ملنا چاہئے۔ اس کا انہیں جواب ملے گا کہ لِكُلٍّ ضِعۡفٌ تم میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب ملے گا۔ پہلی نسل کو اس لئے کہ وہ خود غلط روش پر چلے اور آنے والوں کے لئے غلط روی کا نمونہ بن گئے اور تمہیں اس لئے دگنا عذاب دیا جائے گا کہ تم بھی تو اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے بُری مثال قائم کر گئے۔ وہ تمہارے اسلاف تھے تو تم بعد میں آنے والوں کے اسلاف تھے۔ یہی جواب یہ اسلاف اپنے اخلاف کو دیں گے کہ: فَمَا كَانَ لَكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ۝ (7:39) تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے جو تم ہمارے لئے دہرا عذاب اور اپنے لئے اکہرا عذاب مانگتے ہو! ہم غلط روش پر چلے تھے تو تم نے کونسا اپنی آنکھوں سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کر لیا تھا؟ اس لئے تم اپنے کئے

کا پھل پاؤ۔ ہمیں مطعون کرنے سے کیا حاصل ہے۔

تقلید کا چکر:

تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اپنے دلکش اور حسین انداز میں کتنی عظیم حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ جو قومیں اپنی عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ کر اسلاف کی تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہیں۔ ان پر غلط روی کا ایک ایسا چکر محیط ہوجاتا ہے جس سے وہ باہر نکل ہی نہیں سکتیں۔ ہر نسل، اپنے پیشواؤں کے نقوش قدم پر چل کر تباہ ہوتی ہے۔ اور اپنے نقوش قدم بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑ جاتی ہے تا کہ وہ بھی ان کی طرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گریں۔ دو چار نسلوں کے بعد یہی چیز بطور دلیل پیش کر دی جاتی ہے کہ اگر یہ روش غلط ہوتی تو ہمارے اسلاف صدیوں سے اس پر گامزن کیوں رہتے؟ اقوام سابقہ میں جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی تھی تو خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آجاتا تھا جو انہیں اس چکر۔۔۔ سے نکال کر سیدھے راستے پر لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ نبی کی ضرورت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ لوگ اپنے سابقہ نبی کی کتاب کو بھی مسخ کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں رہتا تھا جس پر وہ اپنی روش کو از خود پرکھ سکتے۔

نجات کا راستہ:

لیکن رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی (نبی) نہیں آئے گا۔ حضور ﷺ کی اُمت کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اس لئے انہیں اس چکر سے از خود ہی نکلنا ہوگا۔ اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اندھوں کی طرح ایک دوسرے کی لکڑی پکڑ کر چلتے رہنے کی بجائے کھڑے ہو کر دیکھیں کہ ہم جس روش پر جا رہے ہیں، خدا کی کتاب اس کے متعلق کیا کہتی ہے۔ اس چکر سے نکلنے کا یہی راستہ ہے اگر ہم سے پہلے کسی دور میں ایسا ہوجاتا تو ہم آج اس غلط راستے پر نہ ہوتے۔ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو ہمارے دور میں ایسا ہوجانا چاہئے تا کہ ہم بھی صحیح راستہ پر چل سکیں اور ہمارے دور میں ایسا ہوجانا چاہئے تا کہ ہم بھی صحیح راستہ پر چل سکیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی غلط راستے کو اپنے لئے سند نہ بنا سکیں۔ اگر ہم نے بھی ایسا نہ کیا تو ہم خود بھی موجودہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے۔ اور آنے والی نسلوں کی غلط روی کے بھی ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ ہر دور کی غلط روی آنے والوں کے لئے سند

میں اضافہ کر دیتی ہے۔۔تم نے (Steel Works) کے کارخانے میں دیکھا تھا جب انجن کو شروع میں (Start) کرتے تھے تو اس کے لئے کافی زور لگانا پڑتا تھا۔لیکن اس کے بعد اس کا (Fly Wheel) خود اپنے زورِ دروں (Momentum) سے تیزی پکڑ لیتا تھا اور اس طرح اس کا ہر چکر آنے والے چکر کے لئے تقویت کا موجب بن جاتا تھا۔یہی کیفیت قوموں کی نفسیات کی ہے۔شروع میں غلط راستے پر چلنے کے لئے کچھ دقت ہوتی ہے۔لیکن بعد میں گذشتہ نسل کی روش، آنے والی نسل کے لئے (Momentum) کا کام دیتی ہے۔اس چکر کو ختم کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ کسی دور کے مسلمان کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کس راستے پر جا رہے ہیں۔

سخت مخالفت:

اگر اس کام کو کسی دور نے کرنا ہے تو وہ ہمارا ہی دور کیوں نہ ہو؟ میں جانتا ہوں (اور خود میری زندگی کا تجربہ اس پر شاہد ہے) کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس آواز کی سخت مخالفت ہوگی۔اس طبقہ میں بیشتر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں فکر و تدبر کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔وہ اپنی موجودہ روش کو، جسے انہوں نے اسلاف کے اتباع میں اختیار کئے ہوتا ہے، دیانت داری سے صحیح روش سمجھتے ہیں، اس لئے اس روش سے ذرا سا بھی ادھر اُدھر ہٹنا ان کے نزدیک جنت کی راہ کو چھوڑ کر جہنم کی طرف چلے جانے کے مترادف ہوتا ہے۔لیکن ان میں سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ روش غلط ہے۔لیکن چونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔اس سے عوام میں نہایت آسانی سے مقبولیت (Popularity) حاصل ہوتی ہے اور دکانداری کو فروغ۔اس لئے وہ ہر اس آواز کی مخالفت کرتے ہیں جو اس راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی دعوت دے۔وہ اس مخالفت میں نہایت اوچھے حربے اختیار کرنے اور کمینے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں۔

لہٰذا اس آواز کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔اب سوال یہی ہے کہ کیا ہم مقبولیت عامہ کی نگاہ فریب جاذبیتوں اور مخالفت کرنے والوں کی ضرر رسانیوں کے احساس سے، اس آواز کو جیتے جی اپنے سینے میں اور مرنے کے بعد پھر مٹی میں دبا دیں یا ان تمام بدنامیوں اور نکوہشوں کے علی الرغم، آنکھیں بند کر کے چلنے والوں سے حضور رسالت مآب ﷺ

کے اتباع میں للکار کر کہیں کہ: اِنَّمَآ اَعِظُکُمۡ بِوَاحِدَۃٍ ۚ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ مَثۡنٰی وَفُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوۡا ۟ (34:46) تم سے فقط ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم خدا کے لئے دو دو، ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو!

اگر اس انبوہ کثیر میں سے کچھ لوگ بھی اس آواز پر کھڑے ہو گئے تو سمجھ لو کہ اس سے آدھا کام ہو گیا۔ اس لئے کہ جو شخص اندھا دھند چلے جانے کے بجائے، کسی پکارنے والے کی آواز پر رک جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار ہے۔ (یا اسے کم ازکم اپنی موجودہ روش کے بارے میں کچھ تردد ضرور لاحق ہو گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ رکتا ہی کیوں) اور اس کے بعد اگر اس نے قرآن کی روشنی میں سوچنا شروع کر دیا، تو پھر کام بن گیا۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص قرآن کی روشنی میں غور وفکر کرے اور صحیح راستہ اس کے سامنے نہ آجائے۔ اور وہ صحیح راستہ اس کے سوا اور کون سا ہے کہ انسان آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے پیچھے نہ چلتا جائے بلکہ وحی کی روشنی میں خود اپنی آنکھوں سے کام لے کر خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلے۔ یہی مسلک قرآن کا بتایا ہوا ہے جس پر نبی اکرم ﷺ گامزن تھے۔

چہ خوش بودے اگر مردِ نکوئے زبندِ پاستاں آزاد رفتے!
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے
(اقبالؒ)

(ترجمہ: کیا ہی اچھا ہوتا اگر نیک انسان اسلاف کی تقلید کی زنجیر سے آزاد ہو کر چلتے۔ تقلید اگر کوئی اچھی چیز ہوتی تو پھر پیمبر بھی اپنے بزرگوں کے راستے کو اپناتے۔)

والسلام

پرویزؔ

(مطبوعہ طلوعِ اسلام فروری 1982ء)